© rasailojaraid.com

تدوین حدیث

(۷)

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ ولہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوئے۔ اس قسم کے غیر اصولی اختلافات میں ہر ایک دوسرے کے اختلاف کو برداشت کرنے کی اپنے اندر صلاحیت اور گنجائش پیدا کرے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی عملی تربیت کا موقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی اختلافات کی وجہ سے مل گیا جو قرآنی الفاظ کے تلفظ وغیرہ میں پیدا ہو گئے تھے، ایسے عجیب وغریب اور دلچسپ واقعات اس سلسلے میں پیش آئے قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت اور تفرق وجدائی کا ذریعہ بنالیا اس بدعادت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے معمولی ناقابل لحاظ اسی قسم کے غیر اہم اختلافات کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف جہاں سکے لئے ناقابل برداشت تھا، بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحب عزم وارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات مثلاً رنگ ونسل کے اختلافات یا وہی مادری بنیادوں پر جو اختلافات مبنی ہیں مثلاً وطن اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ

ظاہر ہے کہ چہروں پر کسی ہونی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے زید کے عمرو کے خاندان میں پیدا ہو جانا یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی اسی طرح زمین کا کرہ جو واقع میں ایک ہے اس کی ملکوں اور اقلیموں میں تقسیم صرف ایک ذہنی اور وہمی تقسیم ہے، کسی دریا یا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصہ لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں، وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ و جدال، قتل و قتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

خیر ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہدِ نبوت میں رونما ہوئے تو شروع میں بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلہ میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

ہشام بن حکیم نماز میں سورۃ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو دیکھا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا، اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوں، لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لئے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقہ سے قرآن کس نے پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سنا۔ ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورہ پڑھی ہے آپ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی حضرت عمرؓ[1] فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا اور جو اس پار ہے پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے اسی طرح الفاظ اور معانی میں کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے گا فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے بلکہ بہت سے لوگ ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو آگ ہی کہتے ہیں مگر لوگ اپنے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کشمکش اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہی ہوا

[1] میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ کدت ان اساورہ کا کیا ہے۔ دیکھو جمع الفوائد ص۱۹ ج ۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے اسی حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا، ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورہ مجھے نہیں پڑھائی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ ارسلہ (تم اس کو یعنی ہشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ہشام کی طرف خطاب کر کے فرمانے لگے کہ

"ہشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے"

حضرت عمر کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا جب ان کا پڑھنا ختم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

ھکذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ کی طرف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوگئے اور فرمایا کہ

"عمر! اب تم پڑھو"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسب ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہو گیا تو دیکھا کہ میری قرأۃ کی طرف بھی اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

ھکذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ما تيسر منه — یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو جو تمہارے لئے آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے، شارحین حدیث نے "سبعۃ احرف" کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے علاوہ اس کے میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی اسی قسم کے اختلافات ہر زبان میں ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جس تلفظ اور جس طریقہ کی عادی ہے اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے میرے نزدیک ان ہی کے لئے اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعۃ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورہ

© rasailojaraid.com

میں کثرت کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا، جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے معین یا خاص عدد بولنے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے اور عربی زبان کا یہ ایک عام محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح بھی نہیں بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی قرآنی اختلافات کی وجہ سے مل گیا۔ کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے کہ قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ و تلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھا کرتے تھے مثلاً روایتوں میں آیا ہے کہ سورہ رحمن کی آیت "علی رفرف خضر و عبقری حسان" کی جو آیت ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا ہے اسی کو "علی رفارف خضر و عباقری حسان" کی شکل میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبارؓ "عموا" اور "عمیا" کو "صمیھا" "خلفا" کو "خلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قصہ اگرچہ ایک شخصی واقعہ ہے لیکن قدرتی غیر ارادی اختلافات کو ارادی و اختیاری مخالفت و مخاصمت کے قالب میں ڈھال دینے کی عادت عربوں میں کتنی راسخ تھی اسی عام عادت کی یہ کتنی اچھی مثال ہے خیال تو کیجئے کہ نماز ہی میں اچھل کر دبوچ لینے کا ارادہ کرنا، نماز کے بعد گردن میں ہشام بیچارے کے چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانا اور سب سے زیادہ اور بڑی بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کو محض اس اختلاف کی وجہ سے بے دھڑک "کذبت" تم جھوٹ بولتے ہو کہنا [illegible] ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہشام کے والد حکیم بن حزام کی حقیقی پھوپھی تھیں اس لحاظ سے بھی ان کا صحابہ میں خاص مقام تھا اس سوا اس کے قریش مکہ کے بھی ممتاز گھرانے سے ان کا تعلق تھا لیکن حضرت عمرؓ میں اس وقت تک اختلافات کے برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اتنے بڑے معزز قریشی بھائی کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت روا رکھتے۔

© rasailojaraid.com

کہ دنیا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے باب میں عرب کے جذبات کس حد تک نازک تھے، مگر پیغمبر کی تربیت نے ان ہی عربوں میں کس رنگ کو پیدا کیا؟ یہی حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کوئی ناگوار اور بری بات کی خبر آپ کو ملتی تو فرماتے کہ

مابقیت انا وھشام فلا یکون ذالک	جب تک میں اور ہشام دونوں آدمی باقی یعنی زندہ ہیں اس وقت تک۔ تو ایسا نہ ہوگا،
اسد الغابہ ج ۵ ص ۶۱	

جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طریقہ کار کا اعلان ہوا کہ باوجود اختلاف رہنے کے آپس میں ایک کا دوسرے سے جدا ہو جانا یا مخالف ہو جانا غیر ضروری ہے بلکہ اختلاف کے ساتھ اتفاق کو بہر حال باقی رکھنا چاہیئے جب قرانی قرأت کے ذریعہ آپ نے صحابہ کی عملی تربیت اس سلسلہ میں شروع کی تو ابتداء میں بعض خطرناک واقعات بھی پیش آتے جن میں سب سے زیادہ اہم حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے صحابہ میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان میں وہ اقرءھم تھے یعنی قران کے پڑھنے والوں میں یہ سب سے اچھے تھے اور اس اقرء ہونے کی یعنی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے اس کی سند بارگاہ نبوت سے ان کو ملی تھی، قران کے ساتھ ان کی خصوصیت کا ذکر مختلف طریقوں سے کتابوں میں کیا گیا ہے، بہر حال ان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ مسجد نبوی میں دو صاحبوں کو نماز میں قران کو اس طریقے سے پڑھتے ہوئے انھوں نے سنا جو ان کی قرأت کے مطابق نہ تھا اور خود ان دونوں کی قرأتوں میں بھی اختلاف تھا حضرت اُبی ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے دربار رسالت پناہی میں حاضر ہوئے اور جو واقعہ تھا اس کا اظہار حضرت اُبی نے کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا تھا مجھے سناؤ جب دونوں سنا چکے تو حضرت اُبی کہتے ہیں کہ تحسین شان عمدہ دونوں ہی کی قراۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا اور کہا کہ خوب پڑھتے ہو، حضرت اُبی جن کا خیال تھا کہ قراۃ قران میں تمام صحابہ میں میں سند سمجھا جاتا ہوں، اپنے نزدیک خیال رکھتے تھے کہ جس قراۃ کو میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ناپسند کیا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کو ناپسند کریں گے، لیکن ناپسند تو کیا کرتے تعریف کی اور پھر ایسی دو قراتوں کو آپ نے سراہا جن میں خود بھی ہر ایک کی قرآت دوسرے کی قرآت سے مختلف تھی یہ حالات ایسے تھے کہ ابی جیسے راسخ الاعتقاد مومن کا بیان ہے کہ [illegible]

فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذکنت فی الجاھلیت

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ حضرت ابی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قراۃ کے ان قدرتی اختلافات میں سے ہر ایک کے لئے گنجائش پیدا کرنا بلکہ دو مختلف باتوں کی تحسین و تعریف ان کی اس فطرت کے لئے جس میں سرے سے اختلافات ہی کی برداشت کی صلاحیت نہ تھی، اسی فطرت کو قرآن کے متعلق تین تین اختلافی شکلوں کے برداشت کر لینے پر آمادہ کرنا ایک ایسی بات تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ العیاذ باللہ پیغمبر کی نبوت اور رسالت ہی کے متعلق شک نہیں بلکہ جیسا کہ وہی کہتے ہیں تکذیب کا شعلہ بھڑک اٹھا، اور کیسا شعلہ، کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت یعنی اسلام لانے سے پہلے تکذیب کی جو کیفیت قلب میں تھی اس کو اس تکذیب سے کیا نسبت؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ اس حسی ذکاوت پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے موجود تھا اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب رب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر ان کے قلب کی حالت کھل گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت

لے یہ مطلب ہے کہ معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے بعض لوگ جو عربی محاورات سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی کوشش انھوں نے اس لئے کی ہے تاکہ حضرت ابی کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے حالانکہ وہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصہ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا مطلب مہمل کر دیتا ہے حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابی ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بیچارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لینا ضروری خیال کیا، حضرت ابی کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کر کے

ضرب فی صدری — وہ تھپڑ میرے سینہ پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل ہے[1] توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ ابی کہتے ہیں

ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ تعالیٰ فرقا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) — میں اس توجہ کے بعد پسینے سے شرابور ہو گیا اور گیا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں

ایک شر تھا جس سے حضرت ابی کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس کا موقعہ ان کو مشکل ہی سے میسر آ سکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کر دیا، سارے مقامات طے ہو گئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا صحیح نہیں ہے بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا قدیم

---

[1] فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتلاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ کا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کا جو حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ بالید ہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک کر فرمایا کہ اب بیٹھو جو بیان کیا گیا ہے کہ اس نبوی توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان اختلافات کا بنانا اس کا انسداد مقصود تھا اور اسی کا مطالبہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ یہی آدم کے اختیار میں ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتدا سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہد صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپرواہیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآنی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی کہ مسئلۂ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقع عملاً آپ کو مل گیا اور اس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو دیتے رہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قرآن کو کچھ ایسے طریقہ سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس نے کیا تھا بیان کیا، ابن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آں حضرت کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ

اقرا کلاکما محسن — دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو

ابن مسعود کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ

ولا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فہلکوا (جمع الفوائد) — آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب تباہ ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قرأتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی ولا تختلفوا (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاءِ مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آتے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا، ان کی وجہ سے علم و عدمِ علم کے اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبرِ آحاد کے معلومات میں کمی و بیشی یا ان کے متعلق علم و عدمِ علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تفقہ کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج و نظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلافات کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالے سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

ان الصدیق جمع الناس بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال	حضرت ابوبکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکم تحدثون عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احادیث تختلفون فیہا والناس بعدکم اشد اختلافا فلا تحدثوا عن رسول اللّٰہ شیئا فمن سألکم فقولوا بیننا وبینکم کتاب اللّٰہ فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ

(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱)

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو، پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "تدوین حدیث" کی تاریخ میں عہد صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیق اکبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انھوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو ہر پڑھنے والا اسی نتیجہ تک پہنچے گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے روک دیا جائے۔

فلا تحدثوا عن رسول اللّٰہ شیئا — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کسی قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا نہ صرف پچھلے ہی زمانہ میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کیا کیا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفا میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

نزدیک ششصد و پنجاہ حدیث از مرویات او در دست محدثین باقی ماندہ است ص ۲۲ ج ۲	تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابوبکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہے۔

ابن جوزی نے (۱۴۲) حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص ۱۸۵) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سو ڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبر پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث

ٹ شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ نے یہ سوال اٹھا کر کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبر کے ساتھ ان کے گوناگوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقع صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا۔ بے چارے حضرت ابوبکر کو چونکہ آں حضرت کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقع نہ ملا اور جو ملا بھی سو خلافت اور اس زمانہ کی سیاسی پیچیدگیوں کے نذر ہو گیا نیز ان کے زمانہ میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثوں کو بیان کرتے تھے، وہ جو خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے محتاج نشدند بہ تبلیغ احادیث تو سط دے بلکہ اکثر آں حدیث از زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند۔ ص ۱۴۱ ج ۲۔ نیز ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات وحوادث کے پیش آنے کے وقت ہوتی تھی ابوبکر صدیق کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ واقعے ان کے سامنے کم پیش آتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں جو ہم ابھی سے کچھ دیر پہلے یہ سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے۔

سوال یہی ہے کہ پھر آخر ان کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا قطع نظر ان باتوں کے کہ عام مسلمانوں نے ان کی تجویز سنی، اور نہ صحابیوں نے اور خود ان کا طرز عمل اس تجویز کے مخالف ہے اصولی سوال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گذر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرتِ اشاعت سے روکتے ہوئے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی ہمت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گذر چکی

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے حقیقت جوئی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آئیے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابوبکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے

انکم تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث تختلفون فیہا والناس بعدکم اشد اختلافا	تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلائل القرآن

(۱)

(جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی)

مستشرقین یورپ کی اندھی تقلید میں بعض دوسرے لوگوں نے قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بڑی قطعیت سے ظاہر کیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ نبی کے الفاظ ہیں کیونکہ نبی اور خدا کے اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سطور ذیل میں اس مسئلہ پر ہم کسی قدر بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ غلط فہمی دور ہوجائے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے آجائے۔ اصل بحث سے پہلے چند باتیں پیش ہیں۔

مطالعۂ قرآن | قرآن حکیم خدا کا ایسا کلام ہے جس کو نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔ اگر وہ ایک طرف معانی اور حکمتوں کا بے پایاں سمندر ہے تو دوسری طرف اس کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ عرب کے ان پڑھ بدو تک اس کو سن کر سیدھا سادا مطلب سمجھ جاتے تھے، خواص صحابہ جو اعلیٰ فہم و فراست اور گہرے علم کے مالک تھے اور جن کی زبان دانی مسلم اور [illegible] مانا ہوا تھا اور جو اسلام کے زندہ نمونے کو دن رات دیکھتے رہتے تھے ان کو بھی ایک ایک سورہ کے مطالب پر برسوں غور کرنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ اس بحر ناپیدا کنار کے احاطے سے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان حضرات نے وہ امور جو دائرۂ فہم انسانی سے خارج تھے ان سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور صرف آیات محکمات جو روح قرآنی کہی جاسکتی ہیں ان کے علم و فہم تفقہ اور تدبر پر قناعت کی اور متشابہات سے بقدر ضرورت لے لیا سارے دریا کو ناپنے کی فکر چھوڑ دی۔ کیونکہ اگر قرآن عزیز کو سطح سے دیکھا جائے تو ایک نظر میں سب دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس کی گہرائیوں کو تفصیل کے ساتھ ناپنا چاہیں تو جس قدر گہرائی میں جائیں گے اس سے آگے اور گہرائیاں ملتی جائیں گی "وہ دریا بیکراں پانی"

© rasailojaraid.com